

تفہیم القرآن

العنکبوت

(۱)

نام | چوتھے رکوع کی آیت مَثَلُ الَّذِينَ أَخَذُوا مِنَ اللَّهِ أَوْلِيَاءَ مَثَلِ الْعُنُكُوتِ سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ سورت ہے جس میں لفظ عنکبوت آیا ہے پس یہ نام بھی عنوان نہیں بلکہ محض علامت ہے۔

زمانہ نزول | آیات ۵۶ تا ۶۰ سے صاف تشریح ہوتا ہے کہ یہ سورۃ ہجرت حبشہ سے کچھ پہلے نازل ہوئی تھی۔ باقی مضامین کی اندرونی شہادت بھی اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ پس منظر میں اسی زمانہ کے حالات جھلکتے نظر آتے ہیں بعض مفسرین نے صرف اس دلیل کی بنا پر کہ اس میں منافقین کا ذکر آیا ہے اور نفاق کا ظہور مدینہ میں ہوا ہے، یہ قیاس قائم کر لیا کہ اس سورہ کی ابتدائی دوں آیات مدنی ہیں اور باقی سورہ کی ہے۔ حالانکہ یہاں جن لوگوں کے نفاق کا ذکر ہے وہ وہ لوگ ہیں جو کفار کے ظلم و ستم اور شدید جسمانی اذیتوں کے ڈر سے منافقانہ روش اختیار کر رہے تھے، اور ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا نفاق مکہ ہی میں ہو سکتا تھا نہ کہ مدینہ میں۔ اسی طرح بعض دوسرے مفسرین نے یہ دیکھ کر کہ اس سورہ میں مسلمانوں کو ہجرت کرنے کی تلقین کی گئی ہے، اسے مکہ کی آخری نازل شدہ سورت قرار دے دیا ہے۔ حالانکہ مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے سے پہلے مسلمان حبشہ کی طرف بھی ہجرت کر چکے تھے۔ یہ تمام قیاسات و مسائل کسی روایت پر مبنی نہیں ہیں بلکہ صرف مضامین کی اندرونی شہادت پر ان کی بنا رکھی گئی ہے۔ اور اندرونی شہادت، اگر پوری سورت کے مضامین پر بحیثیت مجموعی نگاہ ڈالی جائے، مکہ کے آخری دور کی نہیں بلکہ اُس دور

نے حالات کی نشاندہی کرتی ہے جس میں ہجرت حبشہ واقع ہوئی تھی۔

موسوع و مضمون | سودہ کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ مکہ معظمہ میں مسلمانوں پر بڑے مصائب و شدائد کا زمانہ تھا۔ کفار کی طرف سے اسلام کی مخالفت پر زور شہد سے ہو رہی تھی اور ایمان لانے والوں پر سخت ظلم و ستم توڑے جا رہے تھے۔ ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے یہ سونہ ایک طرف صادق الایمان لوگوں میں عزم و ہمت اور استقامت پیدا کرنے کے لیے، اور دوسری طرف ضعیف الایمان لوگوں کو شرم دلانے کے لیے نازل فرمائی اس کے ساتھ کفار مکہ کو بھی اس میں سخت تہدید کی گئی کہ اپنے حق میں اس انجام کو دعوت نہ دیں جو عداوت حق کا طریقہ اختیار کرنے والے ہرزمانے میں دیکھتے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ان سوا اہلت کا جواب بھی دیا گیا ہے جو بعض زوجوں کو اس وقت پیش آئے تھے۔ مثلاً ان کے والدین ان پر زور دیتے تھے کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساتھ چھوڑ دو اور ہمارے دین پر قائم رہو۔ جس قرآن پر تم ایمان لاتے ہو اس میں بھی تو یہی لکھا ہے کہ ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے۔ تو اب ہم جو کچھ کہتے ہیں اسے مانو ورنہ تم خود اپنے ہی ایمان کے خلاف کام کرو گے۔ اس کا جواب آیت ۸ میں دیا گیا ہے۔

اسی طرح بعض نو مسلموں سے ان کے قبیلے کے لوگ کہتے تھے کہ عذاب ثواب ہماری گردن پر، تم ہمارا کہنا مانو اور اس شخص سے الگ ہو جاؤ۔ اگر خدا تمہیں پکڑے گا تو ہم خود آگے بڑھ کر کہہ دیں گے کہ صاحب! ان بے چاروں کا کچھ قصور نہیں، ان کو ہم نے ایمان چھوڑنے پر مجبور کیا تھا، اس لیے آپ ہمیں پکڑ لیں۔ اس کا جواب آیات ۱۲-۱۳ میں دیا گیا ہے۔ جو قصے اس سورے میں بیان کیے گئے ہیں ان میں بھی زیادہ تر یہی پہلو نمایاں ہے کہ پچھے انبیاء کو دیکھو، کیسی کیسی سختیاں ان پر گزریں اور کتنی کتنی مدت وہ سناستے گئے پھر آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کی مدد ہوئی۔ اس لیے گھبرو نہ نہیں۔ اللہ کی مدد ضرور آئے گی۔ گارنٹی کا ایک وعدہ گزرا ضروری ہے۔ مسلمانوں کو یہ سبق دینے کے ساتھ کفار مکہ کو بھی ان قصوں میں

مستنبہ کیا گیا ہے کہ اگر خدا کی طرف سے پکڑ ہونے میں دیر لگ رہی ہے تو یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ کبھی پکڑ ہوگی ہی نہیں پھپھی تباہ شدہ قوموں کے نشانات تمہارے سامنے ہیں۔ دیکھ لو کہ آخر کار ان کی شامت آکر رہی اور خدا نے اپنے نبیوں کی مدد کی۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ اگر ظلم و ستم تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو جاتے تو ایمان چھوڑنے کے بجائے گھر بار چھوڑ کر نکل جاؤ۔ خدا کی زمین وسیع ہے۔ جہاں خدا کی بندگی کر سکو وہاں چلے جاؤ۔

ان سب باتوں کے ساتھ کفار کی تعظیم کا پہلو بھی چھوٹنے نہیں پایا ہے تو حیدر امجد معاذ دونوں حقیقتوں کو دلائل کے ساتھ ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، شرک کا ابطال کیا گیا ہے، اور آئناہ کائنات کی طرف توجہ دلا کر ان کو بتایا گیا ہے کہ یہ سب نشانات اس تعلیم کی تصدیق کر رہے ہیں جو ہمارا نبی تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے۔

اللہ کے نام سے جو رحمن اور رحیم ہے

الف۔ ل۔ م۔ کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جاتیں گے کہ "ہم ایمان لائے" اور ان کو آزما یا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے

۱۔ جن حالات میں یہ بات ارشاد فرمائی گئی ہے وہ یہ تھے کہ مکہ معظمہ میں جو شخص بھی اسلام قبول کرتا تھا اس پر آفات اور مصائب اور مظلوم کا ایک طوفان ٹوٹ پڑتا تھا۔ کوئی غلام یا غریب ہوتا تو اس کو بری طرح مایا پٹیا جاتا اور سخت ناقابل برداشت اذیتیں دی جاتیں۔ کوئی دوکاندار یا کاریگر ہوتا تو اس کی سودی کے دروازے بند کر دیے جاتے یہاں تک کہ بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی۔ کوئی کسی با اثر خاندان کا راجی ہوتا تو اس کے اپنے خاندان کے لوگ اس کو طرح طرح سے تنگ کرتے اور اس کی زندگی اجیرن کر دیتے تھے ان حالات نے کتے میں ایک سخت خوف اور دہشت کا ماحول پیدا کر دیا تھا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کو قابو ہو جانے کے باوجود ایمان لاتے ہوئے ڈرتے تھے، اور

کچھ لوگ ایمان لانے کے بعد جب دردناک اذیتوں سے دوچار ہوتے تو پست ہمت ہو کر کفار کے آگے گھٹنے
 ٹیک دیتے تھے۔ ان حالات نے اگرچہ راسخ الایمان صحابہ کے غم و ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہ کیا تھا، لیکن انسانی
 فطرت کے تعلق سے اکثر ان پر بھی ایک شدید اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ چنانچہ اسی کیفیت کا
 ایک نمونہ حضرت نجاب بن اربت کی وہ روایت پیش کرتی ہے جو بخاری، ابوداؤد اور نسائی نے نقل کی ہے۔
 وہ فرماتے ہیں کہ جس زلزلے میں مشرکین کی تختیوں سے ہم بری طرح ننگ آتے ہوئے تھے، ایک روز میں نے
 دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ کی دیوار کے سایے میں تشریف رکھتے ہیں۔ میں نے حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ
 آپ ہمارے لیے دعا نہیں فرماتے؟ یہ سن کر آپ کا چہرہ جوش اور جذبے سے سرخ ہو گیا اور آپ نے فرمایا
 تم سے پہلے جو اہل ایمان گزر چکے ہیں ان پر اس سے زیادہ سختیاں توڑی گئی ہیں۔ ان میں سے کسی کو زمین میں گڑھا
 کھود کر بٹھایا جاتا اور اس کے سر پر آ رہ چلا کر اس کے دو ٹکڑے کر ڈالے جاتے۔ کسی کے جوڑوں پر لوہے
 کے کھلمے لگائے جاتے تھے تاکہ وہ ایمان سے باز آجائے۔ خدا کی قسم، یہ کام پورا ہو کر وہیں کا یہاں تک
 کہ ایک شخص صنعاء سے حضور موت تک بے کھلمے سفر کر گیا اور اللہ کے سوا کوئی نہ ہو گا جس کا وہ خوف کرے۔
 اس اضطرابی کیفیت کو ٹھنڈے صبر و تحمل میں تبدیل کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو سمجھاتا ہے
 کہ ہمارے جو وعدے دنیا اور آخرت کی کامرانیوں کے لیے ہیں، کوئی شخص مجرد زبانی دعوائے ایمان کر کے
 ان کا مستحق نہیں ہو سکتا، بلکہ ہر مدعی کو لازماً آزمائشوں کی بھٹی سے گزرنا ہو گا تاکہ وہ اپنے دعوے کی صداقت
 کا ثبوت دے۔ ہماری حجت اتنی سستی نہیں ہے، اور نہ دنیا ہی میں ہماری خاص عنایات ایسی ازاں
 ہیں کہ تم بس زبان سے ہم پر ایمان لانے کا اعلان کرو اور ہم وہ سب کچھ تمہیں بخش دیں۔ ان کے لیے تو
 امتحان شرط ہے۔ ہماری خاطر مستقین اٹھانی ہو گی۔ جان و مال کا زیاں برداشت کرنا ہو گا۔ طوح کی
 سختیاں جھیلنی ہو گی۔ خطرات، مصائب اور مشکلات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ خوف سے بھی آزمائے جاؤ گے اور
 لالچ سے بھی۔ ہر چیز جسے عزیز و محبوب رکھتے ہو، ہماری رضا پر اسے قربان کرنا پڑے گا، اور ہر تکلیف جو
 تمہیں ناگوار ہے، ہمارے لیے برداشت کرنی ہو گی۔ تب کہیں یہ بات کھلے گی کہ ہمیں ماننے کا جو دعویٰ تم
 نے کیا تھا وہ سچا تھا یا جھوٹا۔ یہ بات قرآن مجید میں ہر اس مقام پر کہی گئی ہے جہاں مصائب و شدائد

ہیں جو یمن سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون۔

کے ہجوم میں مسلمانوں پر گھبراہٹ کا عالم طاری ہوا ہے۔ ہجرت کے بعد مدینے کی ابتدائی زندگی میں جب معاشی مشکلات، بیرونی خطرات، اور یہود و منافقین کی داخلی شرارتوں نے اہل ایمان کو سخت پریشان کر رکھا تھا، اس وقت فرمایا:

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ تم حنت میں داخل ہو جاؤ گے
حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جو تم سے
پہلے گزرے ہوئے (اہل ایمان) پر گزر چکے ہیں۔ ان پر
سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلا مارے گئے۔
یہاں تک کہ رسول اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے
لوگ پکاراٹھے کہ اللہ کی مدد کی آئیگی تب انہیں شرمہ
سنا یا گیا کہ اجر دار رہو، اللہ کی مدد قریب ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ
مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ
وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ
آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرُ اللَّهُ، أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ
قَرِيبٌ (البقرہ - رکوع ۲۶)

اسی طرح جنگِ اُحد کے بعد جب مسلمانوں پر پھر مصائب کا ایک سخت دُور آیا تو ارشاد ہوا:

کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ حنت میں داخل ہو جاؤ گے
حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے
جہاد میں جان لڑانے والے اور پامردی دکھانے
والے کون ہیں۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ
اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمُ الصَّابِرِينَ
(آل عمران - رکوع ۱۴)

ان ارشادات سے اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت مسلمانوں کے ذہن نشین کی ہے کہ آزمائش ہی وہ کسوٹی
ہے جس سے کھوٹا اور کھرا پرکھا جاتا ہے، کھوٹا خود بخود اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹ جاتا ہے، اور کھرا چھٹ
یا جاتا ہے تاکہ اللہ کے ان انعامات سے سرفراز ہو جو صرف صادق الایمان لوگوں کا ہی حصہ ہیں۔

یعنی یہ کوئی نیا معاملہ نہیں ہے جو تمہارے ساتھ ہی پیش آ رہا ہو۔ تاریخ میں ہمیشہ ہی ہوا ہے کہ
جس نے بھی ایمان کا دعویٰ کیا ہے اسے آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر ضرور تپایا گیا ہے۔ اور جب دشمنوں

ارض القرآن کا سفر

رحنا ب محمد عاصم صاحب،

(۳)

ہم نے رائو صاحب سے مکان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ دریافت کی، تو انہوں نے بتایا کہ ہم تو بسا اوقات اسی طرح مکان کھلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں، پھر سارا سارا دن باہر رہتے ہیں اور جب آپس آتے ہیں تو اپنی ہر چیز کو محفوظ پاتے ہیں۔ اسماعیل خاں صاحب نے بتایا کہ میں جیب آپ لوگوں کو لینے کے لیے بھرن گیا تھا، تو اپنے مکان کو کوئی تالا لگا کر نہیں گیا تھا اور جیب میں تین دن کے بعد واپس آیا، تو میری ہر چیز محفوظ تھی۔ سعودی حکومت میں امن و امان کے بہت سے واقعات تو ہم نے پہلے ہی سنے تھے اور گذشتہ سفر میں خود بھی اس کیفیت کا مشاہدہ کیا تھا، لیکن یہ دو واقعات تو ہمارے لیے حد درجہ حیرت انگیز تھے۔ سوچیے آخر یہ کس چیز کی برکت ہے؟ ہمارے ہاں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اگر یہاں شرعی نظام قائم ہو گیا تو لوگوں کے ہاتھ کٹنا شروع ہو جائیں گے جی ہاں چند ہاتھ کٹیں گے، لیکن سارا ملک چین پائے گا۔

بفتیق | اگلے دن ۱۲ نومبر کو ہم لوگ اپنے پروگرام کے مطابق بفتیق گئے، جو جزیرے مغرب کی طرف تقریباً ۴۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے اور یہاں آرائکو کو سعودی عرب میں تیل کا سب سے بڑا ذخیرہ

بقیہ تفہیم القرآن

موجودہ زمانہ میں دنیا فوقیہ اطلاعات و اخبارات میں آتی رہتی ہیں کہ کشتی نوح کو تلاش کرنے کے لیے بہتات بھیجی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ بسا اوقات ہوائی جہاز جب کوہستان امارات پر سے گزرے ہیں تو ایک چوٹی پر انہوں نے ایسی چیز دیکھی ہے جو ایک کشتی سے مشابہ ہے۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد دوم، ص ۲۰- اور ۲۱)

جائیں گے؟ بڑا غلط حکم ہے جو وہ لگا رہے ہیں۔

جو کوئی اللہ سے ملنے کی توقع رکھتا ہو (اسے معلوم ہونا چاہیے کہ) اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آنے ہی والا ہے، اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ جو شخص بھی مجاہدہ کرے گا اپنے ہی مقابلے میں صبر و ثبات کی نقیض کرنے کے بعد ایک کلہ زجر و توبیخ اُن لوگوں کو خطاب کر کے بھی فرمایا جائے جو ان حق پرستوں پر ظلم و جارحیت تھے۔

۵۔ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ "بہاری گرفت سے بچ کر کہیں بھاگ سکیں گے" اصل الفاظ میں "سَبِقُونَا" یعنی ہم سے سبقت لے جائیں گے۔ اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں یعنی اپنے رسول کے مشن کی کامیابی، وہ تو نہ ہو سکے اور جو کچھ یہ چاہتے ہیں یعنی ہمارے رسول کو نیچا دکھانا، وہ ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ہم ان کی زیادتیوں پر انہیں پکڑنا چاہتے ہوں اور یہ بھاگ کر ہماری دست و پاؤں سے دور لگیں جائیں۔

۶۔ یعنی جو شخص جیانتِ اخروی کا قائل ہی نہ ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ کوئی نہیں ہے جس کے سامنے ہمیں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہو اور کوئی وقت ایسا نہیں آنا ہے جب ہم سے ہمارے کارنامہ زندگی کا محاسبہ کیا جائے، اس کا معاملہ تو دوسرا ہے۔ وہ اپنی غفلت میں پورا ہے اور بے فکری کے ساتھ جو کچھ چاہے کرتا رہے۔ اپنا نتیجہ اپنے اندازوں کے خلاف وہ خود دیکھ لیگا۔ لیکن جو لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ ایک وقت ہمیں اپنے خدا کے حضور حاضر ہونا ہے اور اپنے اعمال کے مطابق جزا و سزا بھی پانی ہے، انہیں اس غلط فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ مورت کا وقت کچھ بہت دور ہے۔ ان کو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بس تریب ہی آگیا ہے اور عمل کی مہلت ختم ہو رہی چاہتی ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی وہ اپنی عاقبت کی بھلائی کے لیے کر سکتے ہوں کر لیں۔ طولِ حیات کے بے بنیاد بھروسے پر اپنی اصلاح میں دیر نہ لگائیں۔

۷۔ یعنی اُن کو اس غلط فہمی میں بھی نہ رہنا چاہیے کہ ان کا سابقہ کسی شہ بے خبر سے ہے جس خدا کے سامنے انہیں جواب دہی کے لیے حاضر ہونا ہے وہ بے خبر نہیں بلکہ سمیع و علیم خدا ہے، ان کی کوئی بات

بھلے کے لیے کر لگیا، اللہ تعیناً دنیا جہان والوں سے بے نیاز بنے۔ اور جو لوگ ایمان لائیں گے اور نیک اعمال کریں گے ان کی برائیاں ہم ان سے دُور کر دیں گے اور انہیں ان کے بہترین اعمال کی جزا دیں گے۔

بھی اس سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

۵۷ "مجاہدہ" کے معنی کسی مخالف طاقت کے مقابلہ میں کشمکش اور جدوجہد کرنے کے ہیں اور جب کسی خاص مخالف طاقت کی نشاندہی نہ کی جاتے بلکہ مطلقاً مجاہدہ کا لفظ استعمال کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک ہمہ گیر اور ہر جہتی کشمکش ہے۔ مومن کو اس دنیا میں جو کشمکش کرنی ہے اس کی نوعیت یہی کچھ ہے۔ اسے شیطان سے بھی لڑنا ہے جو اس کو ہر آن نیکی کے نقصانات سے ڈراتا اور بدی کے فائدوں اور لذتوں کا لالچ دلاتا رہتا ہے۔ اپنے نفس سے بھی لڑنا ہے جو اسے ہر وقت اپنی خواہشات کا غلام بنانے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے۔ اپنے گھر سے لیکر آفاق تک کے ان تمام انسانوں سے بھی لڑنا ہے جن کے نظریات و رجحانات، اصول اخلاق، رسم و رواج، طرز تمدن اور قوانین معیشت و معاشرت دین حق سے متصادم ہوں اور اس ریاست سے بھی لڑنا ہے جو خدا کی فرمانبرداری سے آزاد اپنا فرمان چلاتے اور نیکی کے بجائے بدی کو فروغ دینے میں اپنی قوتیں صرف کرے۔ یہ مجاہدہ ایک دن دو دن کا نہیں، عمر بھر کا، اور دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے ہر لمحہ کا ہے۔ اور کسی ایک میدان میں نہیں، زندگی کے ہر پہلو میں ہر محاذ پر ہے۔ اسی کے متعلق حضرت حسن بصری فرماتے ہیں ان الرجل لیجاہد وما ضرب یوماً من الدنس بسیف ۵ آدمی جہاد کرتا ہے خواہ کبھی ایک دفعہ بھی وہ تلوار نہ چلاتے ۵

۵ یعنی اللہ تعالیٰ اس مجاہدہ کا مطالبہ تم سے اس لیے نہیں کرتا کہ اپنی خدائی قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے تمہاری کسی مدد کی ضرورت ہے اور تمہاری اس لڑائی کے بغیر اس کی خدائی نہ چلے گی۔ بلکہ وہ اس لیے تمہیں اس کشمکش میں پڑنے کی ہدایت کرتا ہے کہ یہی تمہاری ترقی کا راستہ ہے۔ اسی ذریعہ سے تم بدی اور گمراہی کے چکر سے نکل کر نیکی اور صداقت کی راہ پر بڑھ سکتے ہو۔ اسی سے تم میں یہ طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں خیر و صلاح کے علمبردار اور آخرت میں خدا کی رحمت کے حق دار بنو۔ تم یہ لڑائی

ہم نے انسان کو ہدایت کی ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے۔ لیکن اگر وہ

لڑائی لڑ کر خدا پر کوئی احسان نہ کرے گا، اپنا ہی بھلا کرے گا۔

علم ایمان سے مراد ان تمام چیزوں کو سچے دل سے ماننا ہے جنہیں تسلیم کرنے کی دعوت اللہ کے رسول اور اس کی کتاب نے دی ہے۔ اور عمل صالح سے مراد اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا ہے۔ دل و دماغ کا عمل صالح یہ ہے کہ آدمی کی فکر اور اس کے خیالات اور ارادے درست اور پاکیزہ ہوں۔ زبان کا عمل صالح یہ ہے کہ آدمی برائی پر زبان کھولنے سے بچے اور جو بات بھی کرے حق و انصاف اور راستی کے مطابق کرے۔ اور اعضا و جوارح کا عمل صالح یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی اللہ کی اطاعت و بندگی میں، اور اس کے احکام و قوانین کی پابندی میں بسر ہو۔ اس ایمان و عمل صالح کے دو نتیجے بیان کیے گئے ہیں :

ایک یہ کہ آدمی کی برائیاں اس سے دور کر دی جائیں گی۔

دوسرا یہ کہ اسے اس کے بہترین اعمال کی، اور اس کے اعمال سے بہتر جزا دی جائیگی۔

برائیاں دور کرنے سے مراد کئی چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ ایمان لانے سے پہلے آدمی نے خواہ کیسے ہی

گناہ کیسے ہوں، ایمان لاتے ہی وہ سب معاف ہو جاتیں گے۔ دوسرے یہ کہ ایمان لانے کے بعد آدمی

نے بغاوت کے جذبے سے نہیں بلکہ بشری کمزوری سے جو تصور کیے ہوں، اس کے نیک اعمال کا

لحاظ کر کے ان سے درگزر کیا جاتے گا۔ تیسرے یہ کہ ایمان و عمل صالح کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی

کے نفس کی اصلاح آپ سے آپ ہوگی اور اس کی بہت سی کمزوریاں دور ہو جائیں گی۔

ایمان و عمل صالح کی جزا کے متعلق جو فقرہ ارشاد فرمایا گیا ہے وہ ہے **لَنَجْزِيَنَّهُمْ أَحْسَنَ**

الَّذِي كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کے نیک اعمال میں سے جو اعمال

سب سے زیادہ اچھے ہوں گے، ان کو ملحوظ رکھ کر اس کے لیے جزا تجویز کی جاتے گی۔ دوسرے یہ کہ آدمی

اپنے عمل کے لحاظ سے جتنی جزا کا مستحق ہوگا اس سے زیادہ اچھی جزا اُسے دی جائیگی۔ یہ بات دوسرے

مقامات پر بھی قرآن میں فرمائی گئی ہے۔ مثلاً سورہ انعام میں فرمایا **مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرَ مِثَالٍ**

تجھ پر زور ڈالیں کہ تو میرے ساتھ کسی ایسے (معبود) کو شریک ٹھیراتے جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا تو ان کی اطاعت نہ کر۔ میری ہی طرف تم سب کو پلٹ کر آنا ہے، پھر میں تم کو درود (۱۰) جو نیکی لیکر آئے گا اس کو اس سے دس گنا اجر دیا جائیگا۔ اور سورہ قصص میں فرمایا مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ خَيْرٌ مِّمَّا رَزَقَهُ (۹) جو شخص نیکی لیکر آئے گا اس کو اس سے بہتر اجر دیا جائے گا۔ اور سورہ نساء میں فرمایا إِنَّ اللَّهَ لَا يَبْذُلُهُمْ مَتَاعًا زَرْعًا وَإِنْ تَلَكَ حَسَنَةً يَبْذُرْهَا لَكُمْ (۶) اللہ ظلم تو زور پر اہم نہیں کرتا، اور اگر نیکی ہو تو اس کو کئی گنا بڑھاتا ہے۔

۳۔ اس آیت کے متعلق مسلم، ترمذی، احمد، ابو داؤد اور نسائی کی روایت ہے کہ یہ حضرت سعد بن ابی وقاص کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ وہ ۱۸-۱۹ سال کے تھے جب انہوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی ماں حنظلہ بنت سفیان بن امیہ (ابو سفیان کی بھتیجی) کو جب معلوم ہوا کہ بیٹا مسلمان ہو گیا تو اس نے کہا کہ جیت تک تو محمد کا انکار نہ کرے گا میں نہ کھاؤنگی نہ پیوں گی نہ سانسے میں بیچوں گی۔ ماں کا حق ادا کرنا تو اللہ کا حکم ہے تو میری بات نہ مانے گا تو اللہ کی بھی نافرمانی کرے گا۔ حضرت سعد اس پر سخت پریشان ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ماجرا عرض کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ممکن ہے کہ ایسے ہی حالات سے دوسرے وہ نوجوان بھی دوچار ہوئے ہوں جو مکہ معظمہ کے ابتدائی دور میں مسلمان ہوئے تھے۔ اسی لیے اس مضمون کو سورہ لقمان میں بھی پورے زور کے ساتھ دہرایا گیا ہے (ملاحظہ ہو رکوع ۲)

آیت کا منشا یہ ہے کہ انسان پر مخلوقات میں سے کسی کا حق سب سے بڑھ کر ہے تو وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ لیکن ماں باپ بھی اگر انسان کو شریک پر مجبور کریں تو ان کی بات قبول نہ کرنی چاہیے، کجا کہ کسی اور کے کہنے پر آدمی ایسا کرے۔ پھر الفاظ یہ ہیں کہ دان جاہداک۔ اگر وہ دونوں تجھے مجبور کرنے کے لیے اپنا پورا زور بھی لگا دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کم تر درجے کا دباؤ، یا ماں باپ میں سے کسی ایک کا زور دینا تو بدرجہ اولیٰ روک دینے کے لائق ہے۔ اس کے ساتھ مالیں لٹ بے علمہ جسے تو میرے شریک کی حیثیت سے نہیں جانتا، کا فقرہ بھی قابل غور ہے۔ اس میں ان کی بات نہ ماننے کے لیے ایک معقول دلیل دی گئی ہے۔ ماں باپ کا یہ حق تو بے شک ہے کہ اولاد ان کی خدمت کرے، ان کا ادب و احترام کرے، ان کی جائز باتوں میں ان کی

بتا دوں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو۔ اور جو لوگ ایمان لاتے ہو گئے اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہوں گے ان کو ہم ضرور صالحین میں داخل کریں گے۔

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا ہے جو کہتا ہے کہ ہم ایمان لاتے اللہ پر۔ مگر جب وہ اللہ کے

اطاعت بھی کرے لیکن یہ حق ان کو نہیں پہنچا کہ آدمی اپنے علم کے خلاف ان کی اندھی تقلید کرے۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک بیٹا یا بیٹی صرف اس بنا پر ایک مذہب کی پیروی کیے جائے کہ یہ اس کے ماں باپ کا مذہب ہے۔ اگر اولاد کو یہ علم حاصل ہو جائے کہ والدین کا مذہب غلط ہے تو اسے اس مذہب کو پھوڑ کر صحیح مذہب اختیار کرنا چاہیے اور ان کے دباؤ ڈالنے پر بھی اس طریقے کی پیروی نہ کرنی چاہیے جس کی گراہی اس پر کھل چکی ہو۔ امد یہ معاملہ جب والدین کے ساتھ ہے تو پھر دنیا کے ہر شخص کے ساتھ بھی یہی ہونا چاہیے کسی شخص کی تقلید بھی جائز نہیں ہے جب تک آدمی یہ نہ جان لے کہ وہ شخص حق پر ہے۔

ﷺ یعنی یہ دنیا کی رشتہ داریاں اور ان کے حقوق تو بس اسی دنیا کی حد تک ہیں۔ آخر کار ماں باپ کو بھی اور اولاد کو بھی اپنے خالق کے حضور ملٹ کر جانا ہے، اور وہاں ہر ایک کی باز پرس اس کی شخصی ذمہ داری کی بنیاد پر ہونی ہے۔ اگر ماں باپ نے اولاد کو گمراہ کیا ہے تو وہ پکڑے جائیں گے۔ اگر اولاد نے ماں باپ کی خاطر گمراہی قبول کی ہے تو اسے سزا ملیگی۔ اور اگر اولاد نے راہ راست اختیار کی اور ماں باپ کے جائز حقوق ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی، لیکن ماں باپ نے صرف اس تصویر پر اسے ستایا کہ اس نے گمراہی میں ان کا ساتھ کیوں نہ دیا، تو وہ اللہ کے مواخذے سے بچ نہ سکیں گے۔

ﷺ اگرچہ کہنے والا ایک شخص ہے، مگر میں ایمان لایا کہنے کے بجائے کہہ رہا ہے مدہم ایمان لاتے۔ امام رازی نے اس میں ایک لطیف نکتے کی نشان دہی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ منافق اپنے آپ کو ہمیشہ زمرہ اہل ایمان میں شامل کرتے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ایمان کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ گویا وہ بھی ویسا ہی مومن ہے جیسے دوسرے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بزدل اگر کسی فوج کے ساتھ گیا ہے اور اس فوج کے بہادر سپاہیوں نے لڑکر دشمنوں کو مار بھگا یا ہے، تو چاہے خود اس نے کوئی کارنامہ انجام نہ دیا ہو، مگر وہ آکر یوں کہے گا کہ ہم گئے اور ہم خوب لڑے اور ہم نے دشمن کو شکست فاش دے دی۔ گویا آپ

معاملہ میں ستایا گیا تو اس نے لوگوں کی ڈالی ہوئی آزمائش کو اللہ کے عذاب کی طرح سمجھ لیا۔ اب اگر تیرے رب کی طرف سے فتح و نصرت آگئی تو یہی شخص کہیں گا کہ ہم تو تمہارے ساتھ تھے۔ کیا دنیا

بھی انہی بہادروں میں سے ہیں جنہوں نے داد و شجاعت دی ہے۔

۱۴ یعنی جس طرح اللہ کے عذاب سے ڈر کر کفر و محصیت سے باز آنا چاہیے، یہ شخص مندوں کی دی ہوئی تکلیفوں سے ڈر کر ایمان اور نیکی سے باز آ گیا۔ ایمان لانے کے بعد کفار کی دھمکیوں اور مار پیٹ اور نیند بند سے جب اسے سابقہ پیش آیا تو اس نے سمجھا کہ اللہ کی وہ دوزخ بھی بس اتنی ہی کچھ ہوگی جس سے مرنے کے بعد کفر کی پاداش میں سابقہ پیش آتا ہے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عذاب تو بعد میں بھگت لوں گا، یہ نقد عذاب جو اب مل رہا ہے اس سے بچنے کے لیے مجھے ایمان چھوڑ کر پھر زمرہ کفار میں جا ملنا چاہیے تاکہ دنیا کی زندگی تو خیریت سے گزر جائے۔

۱۵ یعنی آج تو وہ اپنی کھالی بچانے کے لیے کافروں میں جا ملا ہے اور اہل ایمان کا ساتھ اس نے چھوڑ دیا ہے، کیونکہ دینِ حق کو فروغ دینے کے لیے وہ اپنی نکمیز تک پھروانے کو تیار نہیں ہے۔ مگر جب اس دین کی خاطر سر و دھڑ کی بازی لگا دینے والوں کو اللہ تعالیٰ فتح و کامرانی بخشے گا تو یہ شخص فتح کے ثمرات میں حصہ بنانے کے لیے آمود و ہمد کا اور مسلمانوں سے کہیں گا کہ دل سے تو ہم تمہارے ہی ساتھ تھے، تمہاری کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے، تمہاری جانفشانیوں اور قربانیوں کی بڑی قدر تمہاری نگاہ میں تھی۔

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ ناقابل برداشت اذیت یا نقصان، یا شدید خوف کی حالت میں کسی شخص کا کلمہ کفر کہہ کر اپنے آپ کو بچا لینا، شرعاً جائز ہے بشرطیکہ آدمی سچے دل سے ایمان پر ثابت قدم ہے، لیکن بہت بڑا فرق ہے اس مخلص مسلمان میں جو بحالت مجبوری جان بچانے کے لیے کفر کا اظہار کرے، اور اس مصلحت پرست انسان میں جو نظریہ کے اعتبار سے اسلام ہی کو حق جانتا اور مانتا ہو مگر ایمانی زندگی کے خطرات و مہالک دیکھ کر کفار سے جا ملے۔ بظاہر ان دونوں کی حالت ایک دوسرے سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتی۔ مگر درحقیقت جو چیز ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ مجبوراً کفر ظاہر کرنے والا مخلص مسلمان نہ صرف عقیدے کے اعتبار سے اسلام کا گرویدہ رہتا ہے، بلکہ عملاً بھی اس

دلوں کے دلوں کا حال اللہ کو بخوبی معلوم نہیں ہے؛ اور اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہی ہے کہ ایمان لانے والے کون ہیں اور منافق کون۔^{۱۶}

کی دلی ہمدردیاں دین و اہل دین کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کی کامیابی سے وہ خوش اور ان کو زک پہنچنے سے وہ بے چین ہو جاتا ہے۔ مجبوری کی حالت میں بھی وہ مسلمانوں کا ساتھ دینے کے بروقت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اس تاک میں رہتا ہے کہ جب بھی اس پر سے اعدائے دین کی گرفت ڈھیلی ہو وہ اپنے اہل دین کے ساتھ جاملے۔ اس کے برعکس مصلحت پرست آدمی جب دین کی راہ کٹھن دیکھتا ہے، اور خوب ناپ تول کر دیکھ لیتا ہے کہ دین حق کا ساتھ دینے کے نقصانات کفار کے ساتھ جاننے کے فوائد سے زیادہ ہیں، تو وہ خالص عافیت اور منفعت کی خاطر دین اور اہل دین سے منہ مٹھ لیتا ہے، کافروں سے رشتہ دوستی استوار کرتا ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ان کی کوئی ایسی خدمت بجالانے سے بھی باز نہیں رہتا جو دین کے سخت خلاف اور اہل دین کے لیے نہایت نقصان دہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ وہ اس امکان سے بھی آنکھیں بند نہیں کریتا کہ شاید کسی وقت دین حق ہی کا بول بالا ہو جائے۔ اس لیے جب کبھی اسے مسلمانوں سے بات کرنے کا موقع ملتا ہے، وہ ان کے نظریے کو حق ماننے اور ان کے سامنے اپنے ایمان کا اقرار کرنے اور راہ حق میں ان کی قربانیوں کو خرچ تحسین ادا کرنے میں فائدہ برابر بخل نہیں کرتا، تاکہ یہ زبانی اعترافات سند میں اور بوقت ضرورت کام آئیں۔ قرآن کریم ایک دوسرے موقع پر ان منافقین کی اسی سو داگرانہ ذہنیت کو یوں بیان کرتا ہے: **الَّذِينَ يَبْتَلِئُونَ بِكُمْ فَإِن كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللَّهِ قَالُوا أَلَمْ نَكُنْ مَعَكُمْ قِيَاتٍ كَانُوا كَاْفِرِينَ فَاصْبِرْ قَالُوا أَلَمْ نَسْتَحْزِزْ عَلَيْكُمْ وَنَمْنَعِكُمْ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ** (انسارہ کوع ۲۰)۔
یہ وہ لوگ ہیں جو تمہارے معاملے میں انتظار کر رہے ہیں کہ اونٹ کس کو ٹھٹھ بٹھتا ہے، اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو اگر کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے؟ اور اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کہ کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور ہم نے پھر بھی تمہیں مسلمانوں سے بچایا؟
۱۶ یعنی اللہ آزمائش کے موافق اسی لیے بار بار لاتا ہے تاکہ مومنوں کے ایمان اور منافقوں کے نفاق کا حال کھل جائے اور جس کے اندر جو کچھ بھی چھپا ہوا ہے وہ سامنے آجائے۔ یہی بات سورہ آل عمران میں

اور یہ کافر لوگ ایمان لانے والوں سے کہتے ہیں کہ تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خطاؤں کو ہم اپنے اوپر لے لیں گے۔ حالانکہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی وہ اپنے اوپر لینے والے نہیں ہیں، وہ قطعاً جھوٹ کہتے ہیں۔ ہاں ضرور وہ اپنے بوجھ بھی اٹھائیں گے اور اپنے بوجھوں کے ساتھ دوسرے بہت سے بوجھ بھی لے۔ اور قیامت کے روز یقیناً ان سے ان اقرا پر دازیوں کی

تراتی گو ہے کہ مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلَىٰ مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ (در کوع ۱۸) "اللہ مومنوں کو ہرگز اس حالت میں رہنے دینے والا نہیں ہے جس میں تم اس وقت ہو کہ صادق الایمان اور منافق سب ملے جلے ہیں۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ نمایاں کر کے رہیگا۔"

علاہ ان کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ اول تو زندگی بعد موت اور حشر و نشر اور حساب و جزا کی یہ باتیں سب ڈھکوسلا ہیں۔ لیکن اگر بالفرض کوئی دوسری زندگی ہے اور اس میں کوئی باز پرس بھی ہوتی ہے، تو ہم ذمہ داری میں کہ خدا کے سامنے ہم سا اذیاب و عذاب اپنی گردن پر لے لیں گے۔ تم ہمارے کہنے سے اس سٹے دین کو چھوڑ دو اور اپنے دین آباتی کی طرف واپس آ جاؤ۔ روایات میں متعدد سرمدان قریش کے متعلق یہ مذکور ہے کہ ابتداءً جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے ان سے مل کر یہ لوگ اسی طرح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ جب وہ ایمان لائے تو ابوسفیان اور حرب بن امیہ بن خلف نے ان سے مل کر بھی یہی کہا تھا۔

علاہ یعنی اول تو یہی ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص خدا کے ہاں کسی دوسرے کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور کسی کے کہنے سے گناہ کرنے والا خود اپنے گناہ کی سزا پانے سے بچ جائے کیونکہ وہاں تو ہر شخص اپنے لیے کا آپ ذمہ دار ہے لَا تَزِدُ وَازِدَةً وَذُرًّا أُخْرَىٰ۔ لیکن اگر بالفرض ایسا ہو بھی، تو جس وقت کفر و شرک کا انجام ایک وحشتی ہوئی جہنم کی سورت میں سامنے آتے گا اس وقت کس کی یہ بہت ہے کہ دنیا میں جو وعدہ اس نے کیا تھا اس کی لاج رکھنے کے لیے یہ کہہ دے کہ حضور، میرے کہنے سے جس شخص نے ایمان کو چھوڑ کر اتنا دیکر رہا، خنبیا کی تھی، آپ اسے معاف کر کے جنت میں بھیج دیں، اور میں جہنم میں اپنے کفر کے ساتھ اس کے کفر کی سزا بھی جگتنے کے لیے تیار ہوں۔

باز پرس ہوگی جو وہ کرتے رہے ہیں

۹ یعنی وہ خدا کے ہاں اگرچہ دوسروں کا بوجھ تو نہ اٹھائیں گے، لیکن دوسرا بوجھ اٹھانے سے بچیں گے بھی نہیں۔ ایک بوجھ ان پر خود گمراہ ہونے کا لہجگا، اور دوسرا بوجھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ان پر لادنا جائیگا۔ اس بات کو یوں سمجھیے کہ ایک شخص خود بھی چوری کرتا ہے اور کسی دوسرے شخص سے بھی کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چوری کے کام میں حصہ لے۔ اب اگر وہ دوسرا شخص اس کے کہنے سے چوری کرے گا تو کوئی عدالت اسے اس بنا پر نہ چھوڑے گی کہ اس نے دوسرے کے کہنے سے جرم کیا ہے۔ چوری کی سزا تو بہر حال اسے ملے گی اور کسی اصول انصاف کی رو سے بھی یہ درست نہ ہوگا کہ اسے چھوڑ کر اس کے بدلے کی سزا اس پہلے چور کو دے دی جائے جس نے اسے بہنکا کر چوری کے راستے پر ڈالا تھا۔ لیکن وہ پہلا چور اپنے جرم کے ساتھ اس جرم کی سزا بھی پائیگا کہ اس نے خود چوری کی سوا، ایک دوسرے شخص کو بھی اپنے ساتھ چور بنا دالا۔ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر اس قاعدے کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **يُجَاهِدُوا أَوْ ذَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَهُمُ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أُمَّةٍ أَرَأَيْتُمْ لِيُضِلُّوْهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ رَّا نَعْلَمُ - رُكُوْع ۱۲ -** تاکہ وہ قیامت کے روز اپنے بوجھ بھی پودے پودے اٹھائیں، اور ان لوگوں کے بوجھوں کا بھی ایک حصہ اٹھائیں جن کو وہ علم کے بغیر گمراہ کرتے ہیں۔ اور اسی قاعدے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ من دعا الی ہدی کان لہ من الاجر مثل اجور من تبعہ لا ینقص ذالک من اجورہ شیئاً ومن دعا الی ضلالۃ کان علیہ من الاثم مثل اثم من تبعہ لا ینقص ذالک من اثمہم شیئاً (مسلم) جس شخص نے راہ راست کی طرف دعوت دی اس کو ان سب لوگوں کے اجر کے برابر اجر ملے گا جنہوں نے اس کی دعوت پر راہ راست اختیار کی بغیر اس کے کہ ان کے اجروں میں کوئی کمی ہو۔ اور جس شخص نے گمراہی کی طرف دعوت دی اس پر ان سب لوگوں کے گناہوں کے برابر گناہ ہوگا جنہوں نے اس کی پیروی کی بغیر اس کے کہ ان کے گناہوں میں کوئی کمی ہو۔

تلاہ "انتر پر دازلین" سے مراد وہ جھوٹی باتیں ہیں جو کفار کے اس قول میں چھپی ہوئی تھیں کہ "تم ہمارے طریقے کی پیروی کرو اور تمہاری خیموں کو ہم اپنا دپرے لیں گے" دراصل وہ لوگ دو غرضات کی نیا

ہم نے فوج کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اور وہ پچاس کم ایک ہزار برس ان کے درمیان رہا۔

پر یہ بات کہتے تھے۔ ایک یہ کہ جس مذہب شریک کی وہ پیروی کر رہے ہیں وہ برحق ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہب تو حید غلط ہے، اس لیے اس سے کفر کرنے میں کوئی خطا نہیں ہے۔ دوسرا مفروضہ یہ تھا کہ کوئی خسر نہیں ہونا ہے اور یہ حیات اخروی کا تخیل، جس کی وجہ سے ایک مسلمان کفر کرنے ہوئے ڈرتا ہے، بالکل بے اصل ہے۔ یہ مفروضات اپنے دل میں رکھنے کے بعد وہ ایک مسلمان سے کہتے تھے کہ اچھا اگر تمہارے نزدیک کفر کرنا ایک خطا ہی ہے، اور کوئی حشر بھی ہونا ہے جس میں اس خطا پر تم سے باز پرس ہوگی، تو چلو تمہاری اس خطا کو ہم اپنے سر لیتے ہیں، تم ہماری ذمہ داری پر دین محمد کو چھوڑ کر دین آبائی میں واپس آ جاؤ۔ اس معاملہ میں پھر مزید دو جھوٹی باتیں شامل تھیں۔ ایک ان کا یہ خیال کہ جو شخص کسی کے کہنے پر جرم کرے وہ اپنے جرم کی ذمہ داری سے بری ہو سکتا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری وہ شخص اٹھا سکتا ہے جس کے کہنے پر اس نے جرم کیا ہے۔ دوسرا ان کی یہ جھوٹا وعدہ کہ وہ قیامت کے روز ان لوگوں کی ذمہ داری واقعی اٹھا لیں گے جو ان کے کہنے پر ایمان سے کفر کی طرف پلٹ جائیں گے۔ کیونکہ جب قیامت فی الواقع قائم ہو جائے گی اور ان کی امیدوں کے خلاف جہنم ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگی اس وقت وہ ہرگز اس کے لیے تیار نہ ہونگے کہ اپنے کفر کا نیا زہ بھگتنے کے ساتھ ان لوگوں کے گناہ کا بوجھ بھی پورا کا پورا اپنے اوپر لے لیں جنہیں وہ دنیا میں بہکا کر گراہ کرتے تھے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ملاحظہ ہو۔ آل عمران، رکوع ۴۔ النساء، ۲۳۔ الانعام، ۱۰۰۔ الاعراف، ۸۔ یونس، ۸۔ ہود، ۳۔ ۴۔ الانبیاء، ۶۰۔ المؤمنون، ۲۰۔ الفرقان، ۴۰۔ الشعراء، ۶۔ الصافات، ۳۔ القمر، ۱۔ الحاقہ، ۱۔ الخ

یہ حصے یہاں جس مناسبت سے بیان کیے جا رہے ہیں اس کو سمجھنے کے لیے سورہ کی ابتدائی آیات کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ دین ایک طرف ذیل ایمان سے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے ان سب اہل ایمان کو آزمائش میں ڈالا ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ دوسری طرف ظالم کافروں سے فرمایا گیا ہے کہ تم اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ تم ہم سے بازی لے جاؤ گے اور ہماری کرتوت سے بچ نکلو گے۔ انہی دو باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لیے یہ تاریخی واقعات بیان کیے جا رہے ہیں۔

۱۲۳۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت نوح کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے منصب پر مرفراز ہونے کے بعد سے طوفان تک پورے ساڑھے نو سو برس حضرت نوح اس ظالم و گمراہ قوم کی اصلاح کے لیے سعی فرماتے رہے، اور اتنی طویل مدت تک اُن کی زیادتیاں برداشت کرنے پر بھی انہوں نے ہمت نہ ہاری۔ یہی چیز یہاں بیان کرنی مقصود ہے۔ اہل ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم کو تو ابھی پانچ سات برس ہی ظلم و ستم سہتہ اور ایک گمراہ قوم کی ہٹ دھرمیاں برداشت کرتے گزرے ہیں۔ دسا ہمارے اُس بندے کے صبر و ثبات اور غم و استقلال کو دیکھو جس نے مسلسل ساڑھے نو صدیوں تک ان شدائد کا مقابلہ کیا۔

حضرت نوح کی عمر کے بارے میں قرآن مجید اور بائبل کے بیانات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بائبل کا بیان یہ ہے کہ ان کی عمر ساڑھے نو سو سال تھی۔ وہ چھ سو برس کے تھے جب طوفان آیا۔ اور اس کے بعد ساڑھے تین سو برس اور زندہ رہے (پیدائش اباب ۷، آیت ۶، باب ۹، آیت ۲۸-۲۹)۔ لیکن قرآن کے بیان کی رو سے ان کی عمر کم از کم ایک ہزار سال ہونی چاہیے کیونکہ ساڑھے نو سو سال تو صرف وہ مدت ہے جو نبوت پر مامور ہونے کے بعد سے طوفان برپا ہونے تک انہوں نے دعوت و تبلیغ میں صرف کی۔ ظاہر ہے کہ نبوت انہیں پختہ عمر کو پہنچنے کے بعد ہی ملی ہوگی۔ اور طوفان کے بعد بھی وہ کچھ مدت زندہ رہے ہونگے۔

یہ طویل عمر بعض لوگوں کے لیے ناقابل یقین ہے۔ لیکن خدا کی اس خدائی میں عجائب کی کمی نہیں ہے جس طرف بھی آدمی نگاہ ڈالے، اُس کی قدرت کے کرشمے غیر معمولی واقعات کی شکل میں نظر آجاتے ہیں۔ کچھ واقعات و حالات کا معمولاً ایک خاص صورت میں رونما ہوتے رہنا اس بات کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے کہ اس معمول سے ہٹ کر کسی دوسری غیر معمولی صورت میں کوئی واقعہ رونما نہیں ہو سکتا۔ اس طرح کے مفروضات کو توڑنے کے لیے کائنات کے ہر گوشے میں اور مخلوقات کی ہر صنف میں خلاف معمول حالات و واقعات کی ایک طویل فہرست موجود ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جو شخص خدا کے قادر مطلق ہونے کا واضح تصور اپنے ذہن میں رکھتا ہو وہ تو کبھی اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتا کہ کسی

آخر کار ان لوگوں کو طوفان نے آگھیرا اس حال میں کہ وہ ظالم تھے۔ پھر نوح کو اور کشتی والوں کو ہم نے بچا لیا اور اسے دنیا والوں کے لیے ایک نشان عبرت بنا کر رکھ دیا۔

انسان کو ایک ہزار برس یا اس سے کم و بیش عمر عطا کر دینا اس خدا کے لیے بھی ممکن نہیں ہے جو موت و حیات کا خالق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر خود چاہے تو ایک لمحہ کے لیے بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن اگر خدا چاہے تو جیت تک وہ چاہے اسے زندہ رکھ سکتا ہے۔

۲۳ یعنی طوفان ان پر اس حالت میں آیا کہ وہ اپنے ظلم پر قائم تھے۔ دوسرے الفاظ میں: اگر وہ طوفان آنے سے پہلے اپنے ظلم سے باز آجاتے تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ عذاب نہ بھیجتا۔

۲۴ یعنی ان لوگوں کو جو حضرت نوح پر ایمان لاتے تھے اور جنہیں کشتی میں سوار ہونے کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی تھی۔ سورہ ہود میں اس کی تصریح ہے: حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورُ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلِّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ إِلَّا مَن سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ۔

آیت ۴۰، یہ بیان ہے کہ جب ہمارا حکم آیا اور نور ابل پڑا تو ہم نے کہا کہ (اے نوح)، اس کشتی میں سوار کرے ہر قسم (کے جانوروں) میں سے ایک ایک پوڑا، اور اپنے گھر والوں کو سوائے ان کے جنہیں ساتھ نہ لینے کا پہلے حکم دیدیا گیا ہے، اور ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں: اور اس کے ساتھ بہت ہی کم لوگ ایمان لاتے تھے۔

۲۵ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس ہولناک عقوبت کو یا اس عظیم الشان واقعہ کو بعد والوں کے لیے نشان عبرت بنا لیا گیا۔ لیکن یہاں اور سورہ قمر میں یہ بات جس طریقہ سے بیان فرمائی گئی ہے اس سے متبادر بھی ہوتا ہے کہ وہ نشان عبرت خود وہ کشتی تھی جو پہاڑ کی چوٹی پر صدیوں موجود رہی اور بعد کی نسلیں کو خبر دیتی رہی کہ اس سرزمین میں کبھی ایسا طوفان آیا تھا جس کی بدولت یہ کشتی پہاڑ پر جا کر ٹکی ہے۔ سورہ قمر میں اس کے متعلق فرمایا گیا ہے: وَحَمَدُنَا عَلَىٰ ذَاتِ الْأَوَّاحِ وَدُشْرِ الْجُرُيِّ بَاعِينَنَا حِزَاءَ

لَمَن كَانَ كَفِرًا وَنَقَدْنَا هَآئِهِ فَهَلْ يَتَذَكَّرُ آيَاتِنَا ۚ أَمْ يَكْفُرُ بِهَا ۚ أَمْ يَكْفُرُ بِهَا ۚ أَمْ يَكْفُرُ بِهَا ۚ

تختوں اور میخوں والی کشتی) پر، وہ چل رہی تھی ہماری نگرانی میں اس شخص کے لیے جزاء کے طور پر جس کا انکار کر دیا گیا تھا، اور ہم نے اسے چھوڑ دیا ایک نشانی بنا کر، پس ہے کوئی سبق لینے والا؟۔ (تفسیر حاشیہ ص ۲۰۵)